ڈاکٹر خواجہ محمد سعید

سر سید احمد خان اور علامہ اقبال کے ذہنی خدوخال

Mind sketch of Sir Syed Ahmed Khan and Allama Iqbal

Dr. Khowaja Muhammad Saeed, Lecturer Department of Philosophy, University of Punjab, Lahore, Pakistan.

Abstract:

In 19th century, the whole world had gone under change. Muslims, being backward, required to have some reawakening from their backward thinking, superstitious nature and their misconceptions of religion & Sufism. They were trying to flee from the bitter realities of life. In these circumstances some sensitive people came in front in order to awaken muslims from their deep slumber. They belonged to different regions of that time such as: Midhat Pasha and Fawad Pasha were from turkey; Shaikh Hadi was from Iran; people belonging to 'Mustafa' school of thought were from Egypt; Imam bin Sanosi was from Tarablus; Syed Jamaluddin Afghani was from Afghanistan; Mufti Alam Jan was from Russia; and Shah Waliullah, Sir Syed Ahmed Khan and Allama Iqbal belonged to India. All these personalities were change agents during their era.

This article presents an analytical study of Sir Syed's and Iqbal's thoughts and their revolutionary struggle. The article comes to a conclusion that if present Pakistanis act on the life practices of Sir Syed in the light of Iqbal's philosophy of 'Self' (khudi), they can attain the position they lost regarding their literary civilization.

فکرِ سر سید کا پس منظر

خالقِ کائنات نے جہاں انسان کو خلق کیا وہاں اُس کی رُشد و ہدایت اور زندگی گزارنے کے اسباب بھی مہیا کیے۔ کبھی پیغمبر بھیجے، کبھی مقدّس صحیفے، گویا ہر زمانے میں کسی نہ کسی طرح پروردگارِ عالم نے انسان کی رہ نمائی اور انسانیت کے تحفّظ کے لیے ذرائع بہم پہنچائے۔ قرآن پاک میں ارشادِ ربّانی ہے کہ:

> اور ہم نے ان کو اسحاق اور یعقوب بخشے اور سب کو ہدایت دی۔ اور پہلے نوح کو بھی ہدایت دی تھی اور ان کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور

ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی۔ یہ سب نیکو کار تھے۔ اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی۔ اور ان سب کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ اور بعض بعض کو ان کے باپ دادا اور اولاد اور بھائیوں میں سے بھی۔ اور ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔[ا]

اِس طرح بہ قول قرآن نوعِ انسانی خواہ وہ کسی بھی فرقے و نسل اور مذہب و مسلک سے متعلق ہو اُس کے لیے اِسی ماحول کے مطابق مُصلح پیدا کیے تا کہ انسان کبھی جہالت کی تاریکی میں گم ہو کر فکری اور ضمیری صلاحیت کے فقدان کا شکار نہ ہو اور نہ ہی تو ہم پرستی، جبر واستبداد اور ظلم و بربریت کا شکار ہو یا شکار بنے بلکہ وہ علم کی روشنی اور رہ نماؤں کی ہدایت سے دُنیائے انسانی میں مقصدِ زندگی سمجھے اور انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر کے معراجِ انسانیت کی منزل پر پہنچ کر فخرِ ملائک بن سکے۔

انسانی تاریخ میں مسلمانوں کی حیرت انگیز ترقی اور عبرت خیز زوال کی داستان سے کون واقف نہیں۔ اُن کا دورِ عروج خصوصاً پہلی سے پانچویں صدی ہجری (مطابق ساتویں سے گیارہویں عیسوی) سے شروع ہوتا ہے جس میں مسلمان جزیرۂ عرب سے نکل کر دنیا کے دور دراز گوشوں میں پھیل گئے۔ مشرق میں خاص طور سے سندھ اور چینی ترکستان اور مغرب میں اندلس تک اپنی حکومت و مملکت کے حدود وسیع کر لیں۔ پھر چھٹی اور ساتویں ہجری (بارھویں اور تیرھویں عیسوی) کے آخر تک قائم رہا اور اُس دور میں دُنیا کی بڑی مملکتیں مثلاً ترکی ایران اور ہندوستان پر مسلمانوں کی شان دار حکومتیں قائم ہوئیں اور اُنھوں نے علوم وفنون، ایجادات واختراعات، تہذیبِ نفس اور نظامِ اخلاق کی تدوین میں اپنی دماغی عظمت اور بلندیٔ فکر اور عملی جدّ وجہد کا نمایاں ثبوت پیش کیا ہے۔ تاریخِ عالم کبھی جھٹلا نہیں سکتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس دور کے مسلمان علم وحکمت میں پوری دنیا میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں سائنسی علوم مثلاً علم کیمیا، طبعیات، فلکیات، طب کے علاوہ فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہ میں اپنا مقام رکھتے تھے لیکن جب مسلمانوں نے ان علوم کو الگ کیا تو پھر مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا اور زندگی کے ہر شعبے میں اُن پر ادبار وانحطاط کا تسلّط ہوتا گیا اور اُن کی تنزّلی کی یہ حالت بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری (اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی) کے نصف تک رہی۔ جن میں ترکی، ایران، ہندوستان اور انڈونیشیا میں مسلمان حکومتوں کا شیرازہ بُری طرح بکھر گیا اور وہ اسلامی ورثوں اور اخلاقی قدروں سے سبکدوش ہو گئیں۔ یہ تھا انیسویں صدی عیسوی کے نصف تک مسلمانوں کے عروج وزوال کا مختصر خاکہ۔

۱۸۵۰ء سے پھر مسلمانوں میں احیاء، روشن خیالی اور بیداری کا احساس پیدا ہوا اور اس جدید

اسلامی نشاۃِ ثانیہ نے ایک طرف تو مشرقِ وسطیٰ میں عرب، یمن، عراق، شام، لبنان اور پھر شمالی افریقہ، مصر، ترکی اور ایران کو متاثر کیا اور دوسری جانب شمال اور شمالی مشرقی ایشیا میں برِصغیر اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کو بیداری کا احساس دلایا۔ اِس طرح مسلمانوں نے ایک بار پھر اپنی اُس کھوئی ہوئی انفرادی اور اجتماعی تمام شعبوں پر محیط جامعیت کو حاصل کرنا شروع کیا اور اُن میں تعلیم، قانون، سائنس میں ترقی، آزادانہ فکر سے انسان، کائنات اور خالقِ کائنات سے باہم روابط کو دیکھنے، دورِ جدید کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مذہب کو سمجھنے اور مربوط کرنے کی قوّت، اور ذہنی بلندی کے رجحانات نمایاں ہونے لگے۔ الغرض انیسویں صدی کی جدیدیت کی تحریک مجموعی طور پر اُن تمام مقاصد کے حصول پر مشتمل تھی جو برصغیر پاک و ہند کے معاشرے کو ایک نئی فکری سمت اور روایت عطا کر سکتے تھے اور اِسی وجہ سے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب اور عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تبدیلی کا تصوّر پیدا ہو۔

انیسویں صدی میں چوں کہ پوری دنیا میں تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی اور وقت اور حالات کا یہ اہم تقاضہ تھا کہ انسان زمانے کے بہاؤ کے ساتھ رابطہ قائم کرتے ہوئے اپنے طرزِ معاشرت کو بدل کر جدید قدروں کو اپنائے اور زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کی راہوں پر گامزن ہو۔ اِسی حالت میں وقت کی پکار مسلمانوں سے فکری احیاء و ذہنی بیداری کی متقاضی تھی، جب کہ وہ اُس وقت بھی پرانے فرسودہ خیالات، توہم پرستی، جمود اور مذہب و تصوّف کے غلط تصوّرات میں پھنسے ہوئے تھے اور زندگی کے حقائق سے دور اور فرار کی تلاش میں رہتے تھے مگر حالات کے تقاضے اور وقت کی ضرورت نے قوم کے چند حسّاس قلب انسانوں کو ایک نئی راہ نکالنے پر مجبور کیا تاکہ وہ قوم کو اُس کی زبوں حالی سے، جس سے وہ بے چین ہو گئے تھے، نجات دلا سکیں اور ترقی کی نئی سمت کا تعیّن کر سکیں۔ اِن حسّاس دل مدبّروں میں خاص طور سے ترکی میں مدحت پاشا اور فواد پاشا، ایران میں مُجتہ الاسلام شیخ ہادی نجم آبادی، مصر میں مصطفیٰ حلقۂ فکر کے اکابر، طرابلس میں امام محمد بن سنوسی، افغانستان میں سید جمال الدین افغانی، روس میں مفتی عالم جان اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ سر سیدؒ، احمد خاں اور بعد میں حکیم الامّت علامہ اقبال قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں یوں تو بہت سے مُصلح اور معمارِ قوم پیدا ہوئے اور جدیدیت کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا مگر خاص طور سے سرسید اور اقبال کے نام سرِ فہرست آتے ہیں۔ پہلے ہم سرسید کے مِشن اور کارناموں پر مختصراً روشنی ڈالیں گے۔

انیسویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف حصہ میں جس اسلامی۔ ہندی جدیدیت کا آغاز ہوا اُس

کے بانی سرسید احمد خان تھے۔ اُن کی تمام زندگی جس پرُ آشوب زمانہ میں بسر ہوئی اُس وقت نہ صرف برِّ صغیر بلکہ کل عالمِ اسلام پر تنزّل وادبار، زبوں حالی اور جہالت کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے۔ اہلِ یورپ جدید علوم وفنون اور زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کی نئی نئی راہیں دریافت کرنے میں محو تھے جب کہ مسلمان قدیم تہذیب کا خستہ لبادہ اوڑھے جہالت وسکوت اور پستی وزوال کے شکار بنے بیٹھے تھے۔ وہ علوم وفنونِ جدیدہ کو عیسائیوں کی چال کہہ کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ خیال کرتے تھے اور اُس کے پڑھنے وسکھانے والوں کو مرتد و کافر ٹھہراتے تھے۔ اِس کے علاوہ اقوامِ یورپ بھی یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ مسلمانوں کے اِس جمود وزوال کا سبب اسلامی تعلیمات ہیں۔ سرسیدؔ نے جدیدیت کی تحریک کا آغاز کیا اور کھلے طور پر عصری تقاضوں کو سمجھتے ہوئے مسلمانوں کو وقت اور حالات کے ساتھ بدلنے، بڑھنے، سائنس اور علومِ عصریہ میں ترقی کرنے کی دعوت دی۔ اُنھوں نے اہلِ یورپ کے اس الزام کو بھی بے بنیاد اور حقیقت سے بعید قرار دیا کہ اسلام میں زمانے کے ساتھ تبدیلی اور احیاء کا تصوّر موجود نہیں۔ سرسید اور اقبال کے نزدیک کتاب اللہ یعنی قرآن مجید اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات، حقیقت وصداقتِ ازلی وابدی کا سرِ چشمہ ہیں اور اِنھی عظیم ذرائع کی روشنی میں، اِن کی تعبیر سے انسان میں ذہنی اور فکری تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے کیوں کہ تبدیلی قانونِ قدرت ہے۔ قوم کے دونوں معمار ومُفکّر اِس عالمی عصری رجحان سے پوری طرح متاثر ومتفق تھے کہ انسان تبدّل پذیر ہے اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں انسانی موقف کو بدلا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سرسید اور اقبال دونوں یہ چاہتے تھے کہ یہ تبدیلی اِس طرح ہونی چاہیے کہ تاریخی ومذہبی تشخص برقرار رہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے ہندوستانیوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً خوف و ہیجان پیدا کر دیا۔ وہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی طور سے بدحالی کا شکار ہو گئے۔ انگریز حاکموں کے جابرانہ ہاتھ مسلمانوں پر ہی پڑتے تھے جس کا اعتراف پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی کیا ہے۔ سرسید کے سامنے جنگِ آزادی کا پورا نقشہ تھا۔ اُنھوں نے ذاتی طور سے جنگ آزادی کے متاثر مُسلمانوں کی زبوں حالی دیکھی تھی اور اِس کے مُضر اثرات سے بہ خوبی واقف تھے اور صرف مسلمان قوم ہی نہیں بلکہ دوسری ہندی غیر مسلم قوموں اور انگریزوں پر بھی جو مظالم ہوئے اُن سب کی بربادی اور بدحالی سے وہ یکساں متاثر تھے۔ ایسے حالات کی کیفیت خود اِن کی زبانی سُنیے:

> ''غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنے گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال واسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا وہ اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اُس کا رنج تھا...

> میں اُس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزّت پائے گی اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اِسی خیال میں رہا اور اِسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اِس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مراد آباد آیا، جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا، اِس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اِس مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں ہمّت بندھانا ہمارا قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرتِ موقوف اور قومی ہم دردی کو ہی پسند کیا۔'' ۲

اِسی قومی ہم دردی و مروّت نے سرسید کو آئندہ چالیس برس مضطرب رکھا اور اِسی پُر سوز اضطراب سے اُن میں متعدد انقلاب آفریں کارنامے سرانجام دینے کی قوّت و ہمّت پیدا ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے جنگِ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرہ میں جو انقلاب آیا اُس نے سرسید کے ذہن پر ایک مجموعی اور کلّی تہذیبی اثر مرتب کیا۔ اِس لحاظ سے سرسید اُن پہلے عظیم ہندوستانی مفکّروں میں ایک ہیں جنھوں نے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر تبدیلی کے ہمہ گیر اور دور رس نتائج کا ادراک کیا اور ایک اثباتی ردِّ عمل کے لئے ذہن کو تیار کیا۔ اِس ضمن میں علاّمہ اقبال نے ٹھیک ہی کہا ہے:

> ''غالباً سرسید احمد خاں دورِ جدید کے وہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی جھلک دیکھ لی تھی، لیکن اُن کی حقیقی عظمت اِس میں ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اِس کے لئے سعی کی۔'' ۳

علی گڑھ تحریک، جس کی شروعات باقاعدہ طور پر ۱۸۶۴ء سے ہوئی، کوئی معمولی تحریک نہ تھی۔ اِس تحریک میں تمام ہندوستانی باشندوں کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً احیاء اور ذہنی بیداری کا پیغام تھا۔ سرسید کی یہ اصلاحی تحریک وقت کی ضرورت تھی۔ اُن کی دور رس نگاہوں نے زمانے کے رُخ کو پہچان لیا تھا۔ سرسید کی یہ اصلاحی تحریک وقت کی ضرورت تھی۔ اُن کی ہمّت اور بلند حوصلے نے اُن میں چٹان کی طرح اپنے قول پہ قائم رہنے کی قوّت پیدا کی۔ زمانے کے نبض شناس ہونے کی وجہ سے مصلحتِ زمانہ کو خوب سمجھتے تھے۔ مسلمانوں میں تقلیدِ محض، سکون، جمود، توہّم پرستی اور قدامت پرستی کے قطعی مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان عقل وشعور سے زمانے کے تقاضوں کو سمجھیں، متحرک ہوں اور ارتقائی منازل کی جانب گام زن ہوتے ہوئے علوم وفنونِ عصریہ حاصل کریں، پیش بین ہوں تاکہ وقت کی رفتار کو سمجھ سکیں اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کی جرأت کر سکیں۔ روایت اور توہّم پرستی کے باعث جو رسمیں مروّج تھیں اور عقلی و مذہبی طور سے فضول و مہمل نظر آ رہی تھیں، اُنھیں ترک کر دینے کی تلقین کی۔ اُنھوں

نے مغربی علوم و فنون اور طرزِ رہائش اور زندگی گزارنے کے ایسے دیگر طور طریقے، جو اسلامی احکام و تعلیمات سے متصادم نہیں تھے، سیکھے اور اختیار کئے اور مسلمانوں کو بھی اِن کی حصول اور عمل پر راغب کیا۔ قدامت پسند مسلمانوں نے مذہب کی آڑ میں اُن پر مخالفت کا طوفان کھڑا کیا اور کفر تک کے فتوے صادر کئے مگر چوں کہ اُن کے دل میں قوم کی تجدید اور بیداری کا ایک راسخ جذبہ موجود اور موجزن تھا اور صدقِ دل سے وہ اِس کی اصلاحی تحریک کی لگن میں تھے، جس کی وجہ سے اُنھیں دشوار سے دشوار تر معاملات میں کام یابی اور سرفرازی نصیب ہوئی۔ وہ نہ تو قوم سے کسی صلے یا ستائش کے خواہاں تھے اور نہ اُنھیں کسی سلطنت یا حکمرانی کی طلب تھی، اُن کو اگر فکر تھی تو اسلام کی سربلندی اور اُس کی صحیح تصویر پیش کرنے کی، اور اگر درد تھا تو صرف اور صرف قوم کی تعمیر کا۔ اپنے مقصد کی حصول کے لئے وہ اٹل رہتے تھے۔ وہ ذہنی بلندی اور کشادہ دلی سے مخالفتوں کے طوفان کا مقابلہ کرتے تھے۔

سر سید کی حقیقی عظمت اِس میں ہے کہ وہ قوم کی تعمیر کے لیے کسی بڑے سے بڑے مشکل کام کو سرانجام دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اُنھیں اِس سلسلہ میں سخت ترین عداوتوں اور حوصلہ فرسا مقاومتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر اُن سے دوسروں کے دلوں میں جگہ بنا لیتے اور سنگ دل سے سنگ دل کو موم بنا لینے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں جب سر سید مدرسۃ العلوم کی داغ بیل ڈالنے کی تیاریوں میں منہمک تھے اور شدید مخالفت ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں لاہور کے ایک جلسے میں اُنھوں نے جو تقریر کی وہ اہلِ فہم و دانش کے لئے غور طلب ہے۔ اِس تقریر کے ہر ہر لفظ سے سر سید کے جذبۂ خلوص، سچی لگن اور اُن کی دردمندی کی کیفیت عیاں ہوتی ہے۔ حالی کی ''حیاتِ جاوید'' سے سر سید کی اِس تقریر کا مختصر سا اقتباس ملاحظہ ہو:

> اے بزرگانِ پنجاب! میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اُس کو اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کے لیے دولت سرا بنانے میں، جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوڑھے چمار، قلی، کافر، بُت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اُس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اُس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ، مجھ کو بھی اِسی مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصوّر کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجئے اور اِس وجہ سے کہ اُس کا بنانے والا یا اُس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ کیا آپ مجھ بدبخت نامہ سیاہ

کی شامتِ اعمال سے اپنی تمام قوم کو (اُن کی اولاد کو) نسلاً بہ نسلاً ڈبونا اور خراب وخستہ حال میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو اس سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔''۴۴

سرسید کے لیے مدرسۃ العلوم کے لیے چندہ کا وصول کرنا سب سے مشکل کام تھا اور جن لوگوں کی اولاد کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا مقصود تھا وہ پہلے ہی سے انگریزی تعلیم کے خلاف تھے اور سرسید کے خلاف فتوے شائع کرتے رہتے تھے۔ مولوی حضرات وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے اور یہ تلقین کرتے تھے کہ سیّد قوم کی بربادی پر تُلا ہے اور سائنس اور انگریزی کی تعلیم پر زور دے رہا ہے، لہٰذا جیسے بھی ممکن ہو اُسے چندہ نہ دیا جائے اور نہ ہی اُس کے کسی کام میں شامل ہوا جائے۔ بہرحال سرسید نے اپنے مِشن کو جاری رکھا اور ہر کام بڑی لگن، نیک نیتی، استقلال اور باقاعدگی سے شروع کیا۔ خود سرسید کا کردار، اُن کا خلوص اور مستقل مزاجی آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے لگی۔ رِسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نے مُسلمانوں کے مزاج میں کافی تبدیلی لانا شروع کی وہ انگریزی تعلیم اور سائنس کی اہمیت سمجھنے لگے اور مذہبی توہّمات، جو ترقی اور تبدیلِ حالات کے سدِّ راہ تھے، آہستہ آہستہ دور ہونے لگے اور لوگوں کو رفتہ رفتہ اِس بات کا یقین ہونے لگا کہ سرسید کو جس کام کے لیے چندہ دیا جاتا ہے وہ اُسی کام میں صرف ہوگا۔ یہ امر سب سے زیادہ فراہمی چندہ کا باعِث بنا اور لوگوں کے خلوص میں اِضافہ کرنے لگا۔

مدرسۃ العلوم کے چندہ وصول کرنے کے موقع پر سرسید نے یہ خیال کبھی نہ کیا کہ وہ خود کون ہیں؟ وہ کس کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں؟ کہاں تک پستی قبول کر رہے ہیں اور کس طرح رقم وصول کرتے ہیں؟ اُنھوں نے نمائش گاہ علی گڑھ میں کتابوں کی دکان تک لگائی، خود کتابیں بیچنے کے لیے دکان پر بیٹھے، مختلف مقامات پر جلسے کیے، اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں اور لطیفے بھی سُنائے، یہاں تک کہ طوائف اور سازندوں سے بھی مدرسہ کے لیے چندہ وصول کیا۔ اِس کارِ خیر کے لیے اُنھوں نے بڑے بڑے لمبے سفر بھی کیے۔ خاص طور سے پٹنہ، گورکھ پور، اِلٰہ آباد، مراد پور، لاہور، امرت سر، پٹیالہ، حیدر آباد، نیل گری، بھوپال، جبل پور اور دیگر متعدد مقامات پر وہ صرف مدرسہ کے تعاون کے لیے گئے۔ وہ مدرسہ کے لیے قلیل سے قلیل رقم کو بھی ویسی خوشی اور کشادہ پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقموں کو لیتے تھے۔ اگر کسی دوست نے اُن کی دعوت کی تو سرسید اُس سے دعوت کے بدلے کا نقد روپیہ لے کر کالج کے چندہ میں جمع کر دیتے تھے۔ ایک بار جب اُنھوں نے پنجاب جانے کا اِرادہ کیا تو اپنے دوست خان بہادر برکت علی خان کو ایک خط لکھا جس کا خُلاصہ کچھ اِس طرح تھا:

''آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا اور احباب میری مہمان داری

میں صرف کرنا چاہیں از راہِ عنایت اُس کی لاگت نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اِسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لیا ہے اور اُس کو کالج کے چندہ میں جمع کر دیا ہے۔ اِس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔''[۵]

مدرسۃ العلوم اور غریب طلباء کی امداد کی خاطر کبھی کبھی سرسید کو سختی سے کام لینا پڑا مگر اُن کی سختی میں بھی وہ درد اور دِل کشی تھی کہ مخالفین بھی اُن کی باتیں سُن کر گرویدہ ہو جاتے تھے۔ ایک بار جب غریب طلباء کے وظیفہ کے لیے کچھ رقم اِکٹھا کرنا مقصود تھی اور جلسہ کی تجویز ٹھہری مگر مخلص دوستوں نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کیا جائے، بے کار میں بدنامی ہوگی اور حاصل بھی کچھ نہ ہوگا۔ سرسید نے اِس کی پروانہ کی بلکہ دوستوں سے یہ کہا:

''اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اُس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اِس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔''[۶]

بہر حال سرسید اپنی بات پر جمے رہے اور جو کچھ اُنھیں کرنا تھا وہ سوچ سمجھ کر کیا۔ اِس جلسہ میں جب وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو ایسی موثر تقریر کی کہ قوم کے رئیس و دولت مند دنگ رہ گئے اور شرم سے اُن کی نظریں جھک گئیں۔ تقریر کے چند جُملے ملاحظہ فرمائیے:

''کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی شخصیت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ! اُس قوم پر جو شرم ناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں اُن کو بے عزّتی کے کام سمجھیں۔ آہ! اُس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدّس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بدصورتی اور دِل کی برائی کا کچھ عِلاج نہ سوچیں۔ آہ! اُس پر جو اپنی قوم کو ذِلّت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کُھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی اور بے حیائی بھی شرما جائے، لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفریں کا کام سمجھے۔''

''اے رئیسو اور اے دولت مندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بُری حالت ہو اور ہمارے بچّوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی اُن لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے۔ مگر اَب اُن کے بچّوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بہ روز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچّے اخراجاتِ تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل اور ذلیل ہوتے جاتے ہیں... پس میں اسٹیج پر اِس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچّوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔''[۷]

اِسی طرح سر سید نے مذہبی ٹھیکے داروں کی بھی خبر لی اور اُنہیں مذہبی مفہوم، اجتہادی اصول اور دین کے پیغامات کی روح سے واقف کرایا اور غیر مُسلموں کے اِسلام پر عائد کردہ الزامات کی زد میں ''خطباتِ احمدیہ'' اور دیگر مضامین لکھے اور خطبات سے اِسلام کی اصل تصویر کو لوگوں کے سامنے رکھنے کی بھر پور کوشش کی۔ سر سید کے مِشن میں مسلمانوں کو سیاست سے علاحدہ رہنے کی بھی ہدایت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اُن کے خیال میں جب تک مسلمان تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں اور عِلمی شعور سے نفع و نقصان کی پرکھ نہ کر سکیں، سیاست میں حِصّہ لینا فضول ہے گو''عالم گیر اسلامیت کے سوال پر اربابِ عقل و دانش نے اُن کی قیادت کی پوری طرح پیروی نہیں کی اور بعد میں اُس پر سخت تنقید کی گئی لیکن سیاسی علاحدگی کے سوال پر ہندی مُسلمانوں کی اکثریت نے اُن کی تقلید کی۔''[۸]

المختصر سر سید کے مشن یا علی گڑھ تحریک کا مُدعا و مقصد یہ تھا کہ مسلمان:

۱۔ قدامت پرستی کا خاتمہ کریں، آزادیٔ فکر اور ذہنی بیداری سے دورِ جدید کے تقاضوں کو سمجھ کر ترقی کی راہوں پر آگے بڑھیں جب تک کہ وہ آزادیٔ فکر سے کام نہیں لیں گے۔ ایک مہذّب زندگی کا تصوّر پیدا نہیں کر سکتے۔

۲۔ ایسے عقائد جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ناروا واقعات راہ میں حائل ہوں، ترک کر دیں اور مذہب کی روح کو سمجھیں۔

۳۔ تمام مذہبی اور دیگر توہُمات سے اجتناب کریں اور عقلِ سلیم کی روشنی میں معاملے کو سمجھ پرکھ کر عملی صورت اختیار کریں۔

۴۔ بچوں کو تعلیم دلانے کی ہر ممکن کوشش کریں کیوں کہ بغیر علم کے زندگی کے کسی بھی شعبے میں ترقی ممکن نہیں جب تک جہالت کو جڑ سے نہیں اُکھاڑا جاتا۔ ارتقائی راہیں ہموار نہیں ہو سکتیں۔

۵۔ عورتوں کو علم کے زیور سے آراستہ کریں، اُن کے حقوق کا ہر ممکن لحاظ رکھیں۔ اُنہیں دستکاری اور دیگر چھوٹے موٹے کام سکھائیں۔

۶۔ سب مل کر تعلیمی سہولیات مہیا کریں تا کہ ہر فرد علم حاصل کر سکے۔

۷۔ مختلف فنون سیکھیں اور کارخانوں کو بڑھاوا دیں تا کہ اقتصادی مسائل آسانی سے حل ہو سکیں اور وہ خود کفیل ہوں اور اُن میں خود اعتمادی آئے۔

۸۔ سیاست سے دُور رہیں اور قوم میں اوّلین علمی و ذہنی بیداری پیدا کریں تا کہ وہ نفع و نقصان میں فرق محسوس کریں۔

۹۔ مغربی علوم وفنون کو سیکھیں اور جدید طرزِ زندگی اپنائیں مگر اُن کی حصولی اور آموزش میں اِس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ کوئی بھی طریق اسلامی احکام وتعلیمات سے تضاد نہ پیدا کرتا ہو۔ گویا جدید علوم وفنون بھی سیکھے جائیں اور مذہبی و تاریخی تشخص بھی قائم رہے۔

الغرض مسلمانوں کی اصلاحِ تعمیر و ترقی کے لئے مندرجہ بالا چند نمایاں مقاصد اور متعدد دوسرے امور جن سے سر سید کی علی گڑھ تحریک مملو و مرکب تھی، معمارِ قوم نے دسویں صدی کے مشہور مسلم فلسفی خازن (ابنِ مسکویہ) کی مشہور آفاق اخلاقی کتاب کے نام پر، اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے ایک اصلاحی پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' اردو میں تجویز کیا اور اُس کے سرنامہ کا بلاک لندن میں تیار کرا کر ۲۱ر اکتوبر ۱۸۷۰ء کو اپنے ساتھ لائے۔ ''تہذیب الاخلاق'' جس کا پہلا شمارہ یکم شوال ۱۲۹۷ھ مطابق ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا، کا بنیادی مقصد، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند بیدار ہوں۔ اُن کی حُسنِ معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو، توہُمات اور غلط اوہام مذہبی جو اِس ترقی اور بیداری کے مانع ہیں اور درحقیقت مذہبِ اسلام کے خلاف ہیں، اُن کو رفع و ترک کیا جائے اور اہلِ یورپ و امریکہ کے اس اعتراض سے کہ 'اسلام جدید تہذیب و تمدّن کا دشمن ہے' قطعی اور واضح دلائل اور حقائق کی روشنی میں اِس اعتراض کو سرے سے روکا جائے، قومی ادبار اور تنزّل کے باعث اخلاق و عادات کی خرابیوں کو بہ طرز احسن مسلمانوں کو متنبّہ کر کے ارتقائی منازل کی جانب مائل کیا جائے۔ فرسودہ بے ہودہ اور مضر رسم و رواج سے نفرت دلائی جائے۔ جدید علوم وفنون اور صنعتوں کو حاصل کرنے اور بڑھاوا دینے اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نوجوانوں میں پیدا کیا جائے اور ساتھ ہی بزرگانِ اسلام کی عظمت اور اُن کے علمی اور عملی کارناموں کی یاد بھی مسلمانوں میں زندہ رکھی جائے، عورتوں مردوں میں تعلیمی شعور کو اُبھارا جائے۔ گویا سر سید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی، مذہبی، تمدّنی، اصلاحی اور تعمیری مضامین لکھ کر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ دعوتِ فکر و عمل دی، اور میں تو یوں کہوں گا کہ صرف مسلمانوں ہی پر نہیں اُنھوں نے انسانیت پر بھی احسانِ عظیم کیا ہے۔ یہ تو رہا معمارِ قوم کا پیغام اور مقاصد کی نشر و اشاعت بہ ذریعہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق''۔

مندرجہ بالا امور کی عملی صورت کے لئے سر سید نے ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (M.A.O. College) کی بناء ڈالی جو بعد میں ۱۹۲۰ء سے ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ اِس ادارے کے قیام سے سر سید کا مقصود یہ تھا کہ یہاں کے طلباء ''مکمّل انسان'' بن کر نکلیں۔ علم و اخلاق کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہو کر دور دراز علاقوں میں نمونۂ علم و عمل بن کر جائیں اور

قوم و مِلّت کو بیدار و زندہ کریں اور باعثِ فخر و رشک ہوں۔ اُنھوں نے ایک طرف سچّے اسلام کا نقشہ پیش کر کے اور جذبۂ آزادی و خودشناسی کا درس دیا اور دوسری طرف علوم کا احیاء اور فکر و نظر کے جادے روشن کر کے عالمِ اسلام کی ذہنی و علمی تعمیر و ترقی کا اثاثہ فراہم کیا۔

فکرِ اقبال

سر سید کی اِسی اصلاحی تحریک کو علاّمہ اقبال نے اپنایا اور اپنی شاعری اور فلسفے کے ذریعہ قوم تک اُس کی آواز پہنچائی۔ اُن کی شاعری اور فلسفیانہ فکر کا مدعا اور ماحصل یہ تھا کہ سر سید کی طرح مسلمانوں میں روشن خیالی اور بیداری کا احساس پیدا کریں اور انھیں مذہبی تشخص اور روحانی ورثے سے آگاہ کریں۔ اُنھوں نے مغرب کے بڑھتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں پر مضر اثرات سے مسلمانوں کو متنبّہ اور باخبر کیا اور ساتھ ہی جدید علوم و فنون، سائنس و ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے اور عصری تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کی دعوت دی۔ وہ مسلمانوں میں جمود، سکوت، قدامت پرستی اور مذہب اور تصوّفِ انسان کے غلط تصوّرات کے قطعی مخالف تھے۔ انسان تبدّل پذیر ہے اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس کے موقف کو بدلا جا سکتا ہے۔ سر سید اور اقبال کے سامنے مذہبِ اسلام اور کتاب اللہ کے یہ حقائق ہیں کہ وقت کے ساتھ انسان اپنی تعمیر و ترقی کی نئی راہیں اختیار کر سکتا ہے کیوں کہ تبدیلی قانونِ قدرت ہے۔ اقبال اِس ضمن میں لکھتے ہیں:

سکونِ محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

اقبال کے نزدیک یہ تبدیلی اِس طرح ہونی چاہیے کہ مسلمان اپنے تاریخی و مذہبی تشخص کو برقرار رکھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ مغربی علوم اور سائنس کا مطالعہ اِسلام کے بنیادی عقائد کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اسلام کے مشاہدے، مطالعے اور منطقی و سائنسی استنباط پر زور دیتا ہے۔ اپنی شاعری اور فکر میں اُنھوں نے یہ واضح کیا کہ علم و حکمت مومن کی میراث ہیں لہٰذا اُس کے لئے لازمی ہے کہ وہ جہاں اُنھیں پائے، حاصل کرنے کی سعی کرے، خواہ وہ مغرب ہو یا مشرق۔ علاّمہ اقبال مشرق و مغرب اُن تمام عوامل سے بالکل باخبر تھے جن کے باعث نوعِ انسانی تباہی و بربادی کی جانب مُڑ رہی تھی۔ مشرق

میں اگر مذہب کا غلط مفہوم و تاویلات، کورانہ تقلید، علم و حکمت سے بیزاری اور بے حسی، سکون و جمود، محکومی و غلامی، تصوّف کے زیرِ اثر فنائے ذات اور نفیِ خودی کا میلان یا جاہل اور رہبانیت پسند صوفیوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ... مسائل مسلمانوں میں تنزّلی و پستی کا باعث تھے تو دوسری طرف مغرب میں باوجود اتنی سائنسی ترقی و کمال کے، لامذہبیت، مادیت پرستی، انسانی ہمدردی و اخوّت اور روحانی قدروں کا فقدان، سیاسی تسلّط و استبداد اور معاشی استحصال وغیرہ ایسے عوامل تھے جن سے اہلِ عرب ذہنی استحصال کا شکار تھے۔ مذکورہ بالا مشرقی و مغربی مسائل کو اقبال سے ''ضربِ کلیم'' میں بڑے مختصر اور جامع الفاظ میں یوں پیش کیا ہے:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی اور تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری
نہ مشرق اُس سے بَری ہے نہ مغرب اِس سے بَری

اِسی مفہوم کو مولانا جلال الدین رومی نے اپنے فارسی کلام میں یوں پیش کیا ہے:

مشرق حق رادید عالم راندید
غرب در عالم خزید از حق رَمید

اقبال نے مشرقی اور مغربی مسائل و معاملات کا ادراک کیا۔ بنی نوع انسان کو عقل و عشق کا درسِ عظیم دیا۔ اُن کے نزدیک مسلمان اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک اُن میں ترکِ دنیا کے بجائے جہدِ حیات کو اپنانا، ذہنی قرار کی جگہ عقل کی بیداری لانا، جدید علوم و فنون سے آگاہی اور وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر بدلنا نہیں سیکھتے ہیں۔

اقبال نے سرسیّد کے بعد قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے قرآن کریم اور احادیثِ رسول ﷺ کا سہارا لیا۔ اسلامی فکر کی تعمیرِ نو اور اجتہادی نقطۂ نظر کو پیش کر کے مسلمانوں کے مُردہ اور خوابیدہ ذہن کو زندہ اور بیدار کیا۔ اُن کی فکر کا ماٰخذ قرآن ہے اور دعوتِ اسلام میں توحید، کتاب اللہ، رسالت، آزادی و تخلیق، اخوّت و مساوات اُن کے خاص موضوعات ہیں۔ اُن کا فلسفہ ''خودی'' یا انسانی عظمت اِن سب کا مرکز ہے اور اِسی مرکز (انسانی خودی) کی معرفت سے انسان اپنی منتہا یعنی خالقِ کائنات کو پہچان سکتا ہے اور اسرار و رموز سمجھ سکتا ہے۔ اُن کی شاعری اور فکرِ انسانی خودی و عظمت میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جس نے خودی کی پہچان کر لی اُس نے کائنات اور خالقِ کائنات کو پہچان لیا ورنہ یہ علوم و سائنس کا ترقی

کرنا اور انسان کا چاند پہ قدم رکھنا بے معنی ہے۔ اپنی کتاب ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم ''زمانۂ حاضرہ کا انسان'' میں اِس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا

سر سیّد و اقبال کے کلام و پیغام میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں مفکّرین نوعِ انسان کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً تعمیر و ترقی کے خواہاں ہیں۔ اُن کے نزدیک آزادی اخوّت، مساوات، نرمی و بلند خیالی اور روحانی و اخلاقی اقدار کی حامل قوم ہی وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر ترقی کی منازل پر آگے بڑھ سکتی ہے۔ اپنی ذات کا عرفان اور اپنی مدد آپ کرنے کا اصول فرد اور جماعت کو ترقی و عظمت عطا کر سکتا ہے اور محکومی، غلامی اور کورانہ تقلید سے نجات دلا سکتا ہے۔ مردِ مومن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تقدیر پہ تکیہ نہیں کرتا بلکہ اپنی نگاہ سے تقدیر بدل دیتا ہے۔ اپنی مدد آپ کرنے کا گُر ایک ایسا گُر ہے جس کی بدولت انسان دُنیا و آخرت میں کام یابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ سر سیّد کے نزدیک ''یہی گُر یہی اصول'' ''ترقی کی سچی بنیاد ہے'' اپنے مضمون ''اپنی مدد آپ میں'' وہ فرماتے ہیں:

> ''آدمی جس قدر دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں، خواہ وہ اپنی بھلائی اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ پر ہی کیوں نہ کریں، یہ امر بدیہی اور لابدی ہے کہ وہ اِس قدر بے مدد اور بے عزّت ہو جاتے ہیں... بڑا سچا اور نہایت مضبوط، جس سے دُنیا کی معزز قوموں نے عزّت پائی ہے، وہ اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ جس وقت لوگ اِس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جائیں گے۔ اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ، یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے، اور پہلا خود انسان کو۔''[۹]

اقبال کے یہاں بھی بالکل ایسی ہی کئی مثالیں موجود ہیں وہ بھی اپنی دُنیا آپ پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں۔ تخلیق، انسانی حیات کی روح ہے۔ آزادی و تخلیق سے انسان ناموافق دُنیا اور بے معنی زندگی کو بدل کر نئی موافق دُنیا اور معنی خیز زندگی لا سکتا ہے۔ اِس ضمن میں اقبال کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کُن فِکاں ہے زندگی

پھونک ڈالے یہ زمین و آسماں مُستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

مختصر یہ کہ سرسیّد احمد خاں اور اقبال جدید اسلامی ہندی نشاۃِ ثانیہ کے بانی اور معمارِ قوم ہیں۔ قوم و مِلّت کی تعمیر و ترقی اور تشکیلِ نو اُن کا بنیادی مقصد تھا۔ وہ مسلمانوں کو جہالت اور سکوت سے نکال کر علم اور حرکت کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی دعوت ظلمات سے نور کی طرف تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے مذہبی و روحانی ورثوں کو برقرار رکھتے ہوئے سائنس، ٹیکنالوجی اور علوم و فنونِ جدیدہ کو حاصل کریں، زمانے کے بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کریں۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور جھنجھوڑا کہ وہ اُٹھیں اور ایک نئے دور کا آغاز کریں اور اپنے مستقبل کو ستارے کی طرح درخشندہ و تابناک بنائیں، جیسا کہ اقبال کہتے ہیں:

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

سرسید احمد خان اور علامہ اقبال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے قومی وجود کے تشخص کی جدوجہد میں دو بڑے نام ہیں۔ ان دونوں میں قدر مشترک تھی وہ یہ کہ دونوں اپنی قوم کو جدید حالات کے مطابق تیار کرنا چاہتے تھے تاکہ ان میں قومی اور سیاسی شعور بیدار کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے مسلمانوں کی تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور ادبی اصلاح کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی جبکہ اقبال نے نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالم اسلام کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ سرسید اور علامہ اقبال میں مقاصد اور عمل کے حوالے بڑی حد تک مماثلت تھی۔ دونوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو تقلید اور جمود سے آزاد کرنے اور ان میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دونوں اس بات کے قائل تھے کہ اسلام میں ہر عہد کے مسائل کے حل کے لئے رہ نمائی موجود ہے۔ اسلامی شریعت اس کا نام اجتہاد ہے جس کی ضرورت کو سرسید اور علامہ اقبال دونوں نے محسوس کیا۔ جس دور میں علامہ اقبال نے آنکھیں کھولیں یہ دور سرسید کی تحریک کا دور تھا۔ علامہ اقبال کے استاد سید میر حسن سرسید سے بہت متاثر تھے چناں چہ اقبال اپنی ابتدائی زندگی میں ہی سرسید کی تحریک سے آشنا ہو گئے تھے۔ اقبال کی نظر میں سرسید احمد خان:

> ”... عصر جدید کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تھی اور یہ محسوس کیا تھا کہ ایجابی علوم اس دور کی خصوصیت ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا۔ مگر سید احمد خان کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لئے سرگرم ہو

گئے۔ ہم ان کے مذہبی خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حساس روح نے سب سے پہلے عصر جدید کے خلاف ردعمل کیا۔'' ۱۰

سرسید نے مسلمانوں کی کم زوریوں کو دور کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے کے لئے جو کوششیں کی علامہ اقبال نے ان کا اعتراف مغربی افکار، فلسفہ اور شاعری میں دل چسپی کے ساتھ ساتھ سر سید احمد کی طرح علامہ اقبال بھی شروع میں اسی خیال کے حامی تھے کہ مسلمانوں کو سیاسی آزادی کے لئے ضروری شعور حاصل ہونے تک انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ سرسید کی طرح علامہ بھی مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم ہی کو قرار دیتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی علامہ اس جدید تعلیم کے مخالف تھے جو نوجوان نسل کی ذہنیت اور روحانی فطرت کو بدل ڈالے۔ مغربی تہذیب اور جدید تعلیم کے مضر اثرات سے وہ بہ خوبی واقف تھے چناں چہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

سرسید احمد خان کی طرح علامہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ تعلیم کے اصول میں دین اور دنیا کا امتزاج ہونا چاہئے۔ جس طرح سرسید کا خیال تھا کہ:

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ کا تاج سر پر۔'' ۱۱

اسی طرح علامہ بھی اس خیال کے حامی تھے کہ:

''... خالص دنیوی تعلیم سے اچھے نتائج نہیں پیدا ہوئے اور خصوصاً اسلامی ممالک کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور کسی ملک کے تعلیمی مسائل کے متعلق فیصلہ کرنے میں اس ملک کی خصوصی ضروریات کو خاص طور پر مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔'' ۱۲

سرسید کی طرح علامہ نے بھی ان علماء پر تنقید کی جو روحِ اسلام سے نا آشنا ہیں۔ علامہ کا خیال تھا کہ قرآنی تعلیمات صرف ایک زمانے یا وقت کے لئے نہیں بلکہ ہر زمانے اور وقت کے لئے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ سرسید کی طرح اس بات کے بھی قائل تھے کہ جدید سائنس حقیقی اسلام کے منافی نہیں۔ سرسید نے اجتہاد کے دروازے کو کھولنے کی جو کوششیں کی علامہ بھی اجتہاد کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ علامہ کے نزدیک مسلمانوں کے ذہن پر جو جمود طاری ہے اس کا تدارک اجتہاد ہی ہے۔ جب علمائے سہارن پور

نے سرسید کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا تو علامہ نے اس فتویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"یہاں بحث سرسید کے معتقات سے نہیں، بحث اس امر سے ہے کہ اسلام اور کفر کا مابہ الامتیاز کیا ہے؟ اسلام جو کچھ بھی ہے اپنی جگہ پر واضح ہے۔ اس میں الجھاؤ ہے نہ ایچ پیچ کہ ہم اسلام اور کفر میں فرق نہ کر سکیں، یا اس باب میں کسی مخصوص تنظیم کا رخ کریں۔ علمائے سہارن پور نے یہ نہیں سوچا کہ سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی، تہذیب الاخلاق نکالا، علی گڑھ کالج قائم کیا یا مسائل الہیات پر قلم اٹھایا تو اس سے ان کا مدعا کیا تھا... یہی کہ مسلمانوں کو اپنی وحدت کا شعور ہو۔ وہ ایک قوم ہیں۔ لہٰذا بہ حیثیت ایک قوم انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ مغرب کے سیاسی، معاشی استیلا یا علوم وفنون میں ان کے اجتہادات اور اختراعات نے ہمارے لیے کیا مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ وہ اعتماد رکھیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور علم وحکمت کی جو روانگریزی تسلط کے ساتھ آگئی ہے، ڈرنے کی چیز نہیں۔ ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیے۔ اسلامی عقائد کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔"[13]

اس وقت کے علماء نے سرسید پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ نیچری ہیں لیکن علامہ فطرت کے اس اصول کو مانتے ہیں۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں کہ:

"...فرض کیجیے حادثہ الف رونما ہوا ہے اور یہ حادثہ کسی دوسرے حادثہ کی علت ہے تو بحیثیت معلول حادثہ ب کا ظہور گویا پہلے سے متعین ہو چکا ہے، لہٰذا حادثہ ب وقوع میں آئے گا، اور ضرور آئے گا۔ یہ "نیچر" ہے اور نیچر کی کاروائی رُک نہیں سکتی نہ اسے کوئی روک سکتا ہے۔ نیچر اپنا کام کرتا رہے گا۔ حوادث کی ترتیب، علت ومعلول کی پابند ہے اور اس ترتیب میں ردوبدل ناممکن۔ یہ گویا امر ربی ہے۔"[14]

اسی طرح اقبال فطرت کی ایک نئی توجیہہ کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"...قرآن پاک عین فطرت ہے۔ لہٰذا فطرت اللہ کا انکشاف جس پر انسان کو پیدا کیا گیا۔ قرآن ہی کے ذریعے ہوا۔ پھر یہ فطرت اس نظامِ حیات ہی میں مشہور ہوئی جس کو اس نے دین کہا ہے اور دین کا تقاضہ ہے وہ اعمال وعقائد جو ہر پہلو سے زندگی کو سہارا دے رہے ہیں اور جس کو اصطلاحاً شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم کہیں گے قرآن پاک میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی۔ گو انسان کو تصورات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی قانون کی۔ یہ انسان کی عقل، اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہے جس میں قرآن مجید کا قانونِ حیات منکشف ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔"[15]

سرسید نے جس اجتہاد کی بات کی ہے وہ صرف اس وقت کے حالات کے لئے نہیں تھی بلکہ وہ اس کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے تھا اور بعد میں آنے والے وقت کے لئے بھی اس کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ اقبال نے بھی اپنی فلسفیانہ بصیرت سے اسی نقطہ کو پایا تھا چناں چہ انھوں نے "تشکیل جدید

الٰہیات اسلامیہ میں'، جو بنیادی طور پر ان کے سات لیکچرز پر مشتمل ہے اس میں "اجتھاد فی الاسلام" کے نام سے پورا لیکچر دیا ہے۔ اس لیکچر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ کس طرح آج کے مسلمان اس اخلاقی روح کو برقرار رکھ سکتے ہیں جو قرآن کی تعلیم نے ان کی روح میں پھونکی ہے اور کیسے مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قوت کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ اقبال بھی سر سید کی طرح اس بات کے حامی تھے کہ یہ تب ہی ممکن ہے جب مسلمان اسلام کے بنیادی اصول قانون کی روح سے واقف ہوں اور جدید سائنسی انکشافات سے واقفیت حاصل کرتے رہیں۔ علامہ کو اس بات کا احساس تھا کہ الہامی کتب اور سائنس کی صداقتوں میں تضاد نہیں ہوسکتا اگر کوئی تضاد نظر بھی آتا ہے تو اسے الہامی کتب کی تشریح وتعبیر کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔ سر سید نے اس کا یہ حل پیش کیا کہ اسلام ایک مکمل نظامِ فطرت ہے جسے سائنسی اصولوں کی تشریح کی پوری گنجائش ہے چنانچہ سر سید نے قوانینِ فطرت اور قوانینِ اسلام میں ہم آہنگی اور وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا سارا مذہبی تصور اس اصول پر تھا کہ "اسلام هو الفطرة و الفطرة هي الاسلام" انھوں نے اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے توحید، رسالت، وحی، روح، جنت، دوزخ، ملائکہ، شیطان، معجزات سب کو قوانینِ فطرت کی بنیاد پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے ہاں بھی اسی طرح کے تصورات ملتے ہیں مثلاً جنت دوزخ کسی مقام یا جگہ کے نام نہیں بلکہ یہ انسان کے داخلی خصائص ہیں۔ اسی طرح غلامی کے بارے میں بھی اقبال کا وہی نقطۂ نظر تھا جو سر سید احمد خان کا تھا۔ علامہ کے نزدیک غلامی بڑے وسیع معنی میں ہے یہ صرف سیاسی غلامی ہی نہیں بلکہ مغرب کی غلامی، ماضی کی غلامی، سرمائے کی غلامی، رنگ ونسل کی غلامی سبھی کچھ آجاتا ہے۔ انھوں نے توحید کے عقیدے کو انسان کی حریتِ فکر اور مساوات کا ستون اس لئے کہا کہ اس کے زیرِ اثر ہر قسم کی غلامی سے نجات مل جاتی ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

دنیائے اسلام میں جمال الدین افغانی اور سر سید احمد کے بعد علامہ اقبال ہی وہ واحد شخصیت ہیں جس نے احیائے اسلام کے لئے ٹھوس اور مربوط فکر کی تشکیل کی جس میں انھوں نے عالمِ اسلام کے لئے آزادی، خودمختاری اور بہتر مستقبل کا پیغام دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سر سید کی فکر سے کسی بڑے اختلاف کا اظہار نہیں کیا بلکہ دونوں کی فکر میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

حواشی

۱۔ القرآن، ۶:۸۵۔۸۸۔
۲۔ سرسید احمد خان، مقالات سرسید (مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲، ص ۲۷۸۔
۳۔ اقبال محمد، علامہ، اسلام اور احمدیہ تحریک، ص ۲۱۔
۴۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، نیشنل بک ڈپو، لاہور، ۱۹۸۶، ص ۱۴۳۔
۵۔ ایضاً، ص ۱۹۹۔
۶۔ ایضاً، ص ۱۹۵۔
۷۔ ایضاً، ص ۱۹۶۔
۸۔ خطباتِ سرسید، مُرتبہ سراج الدین، ۱۸۹۲ء، ص ۲۴، ۲۷۵۔۲۷۶۔
۹۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید، جلد چہارم (مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲، ص ۶۹۔
۱۰۔ حرفِ اقبال، ص ۱۴۸۔
۱۱۔ بہ حوالہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۶، ص ۱۱۹۔
۱۲۔ شیخ عطا اللہ، ''اقبال نامہ'' جلد اول، (مکاتیب مجموعہ اقبال) اقبال اکیڈمی، لاہور، ص ۴۱۴۔
۱۳۔ نذیر نیازی (مرتب)، اقبال کے حضور، ص ۲۸۵۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۳۵۹۔۳۶۰۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۵۴۔۵۵۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ قرآن پاک
۲۔ خان، سید احمد: ''مقالات سرسید'' مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء۔
۳۔ حالی، الطاف حسین: ''حیاتِ جاوید''، لاہور، نیشنل بک ڈپو، ۱۹۸۶ء۔
۴۔ ''خطباتِ سرسید'' مرتبہ سراج الدین، ۱۸۹۲ء۔
۵۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، ''اقبال اور جدید دنیائے اسلام''، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۶ء۔
۶۔ عطا اللہ، شیخ، ''اقبال نامہ'' ج اول (مکاتیب مجموعہ اقبال)، لاہور، اقبال اکیڈمی، سن ندارد۔
۷۔ حرفِ اقبال
۸۔ نذیر نیازی: مرتب اقبال کے حضور (مرتب نذیر نیازی)

O ------- O